بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

آہ ناموسِ شریعت و قاموسِ علم

وا دریغا! آج ہم کو اس ذات گرامی کا مرثیہ لکھنا ہے جس کا قلم عمر بھر قرآن و حدیث کے اسرار و حِکَم کے کشف و تحقیق میں گہرافشانی کرتا رہا۔ آج زبانِ خامہ کو اس کی ماتم سرائی کا فرض انجام دینا ہے جو زندگی بھر ملت بیضا کی جراحتوں کے لئے مرہم کی بہم رسانی کی فکر میں لگا رہا۔ جس کی زبان قرآن کی ترجمان تھی اور جس کا نطق نوامیس شریعت کا بیان۔ حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا سانحۂ وفات اگرچہ "وطن سے دور" پیش آیا لیکن الحمد للہ کہ "دیارِ غیر" میں نہیں جہاں غالب کے بقول بیکسی کی شرم کے رہ جانے کی تمنا ہوتی ہے شمار فرزندانِ توحید نے نماز جنازہ پڑھی اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جو ذاتِ خود ایک انجمن ہو وہ وطن سے دور رہ کر بھی تنہا نہیں ہوتا۔ وہ جہاں بیٹھتا ہے اپنی دنیا آپ پیدا کر لیتا ہے۔

دیوبند گرچہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے لیکن مقامی اعتبار سے یہاں کے تین خاندانوں نے اس کو ہندوستان کے آسمان شہرت پر آفتاب و ماہتاب بنا کر چمکایا اور اسے اس مرز و بوم کی کلاہ افتخار کا گوہر نور بنا دیا۔ ایک مولانا نانوتویؒ کا خاندان جن کے فرزند ارجمند حضرت حافظ محمد احمد صاحب مرحوم تھے۔ دوسرا مولانا ذوالفقار علی مرحوم کا خاندان جس کے گل سرسبد حضرت شیخ الہند تھے اور تیسرا خاندان مولانا فضل الرحمن صاحب عثمانی مرحوم کا تھا جن کے دو صاحبزادے عارف عصر و شیخ طریقت حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور عربی کے بہترین ادیب اور فطری شاعر مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ عہد حاضر کے اکابر علما و فضلا تھے۔ حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد عثمانی اسی خاندان کے گل شب چراغ اور مولانا فضل الرحمن صاحبؒ کے فرزند ارجمند تھے۔

حضرت الاستاذ ماہ محرم ۱۳۰۵ھ میں دیوبند میں پیدا ہوئے اس وقت آپ کے والد ماجد ضلع بجنور میں انسپکٹر مدارس کے عہدہ پر مامور تھے تعلیم دارالعلوم دیوبند میں پائی، اپنی غیر معمولی ذکاوت وذہانت کی وجہ سے طلباء میں ہمیشہ ممتاز اور اساتذہ میں موقر ومحبوب رہے[عہ]۔ دارالعلوم دیوبند کا یہ دور نہایت شاندار تھا۔ درسِ حدیث کی مسند حضرت شیخ الہند کے وجودِ گرامی سے مزین تھی ہی اور اساتذہ بھی اپنے اپنے علوم وفنون کے ماہر اور نامور استاذ تھے۔ اساتذہ ایسے اور شاگرد حضرت الاستاذ ایسا۔ پھر کمی کس چیز کی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عنفوان شباب ہی میں اسلامی علوم وفنون کے بلیغ النظر مبصر بن گئے پھر چونکہ ذہانت آپ کا جوہر تھی اور خوش تقریری وخطابت ایک فطری ملکہ اس بناء پر سب سے کم سِن ہونے کے باوجود جلد ہی اکابر دیوبند میں شمار ہونے لگے۔ حضرت الاستاذ کی ذات سے سلسلۂ دیوبند کے دورِ آخر کی پوری تاریخ مربوط تھی۔ آج وہ عہد زریں یاد آتا ہے تو سینہ پر سانپ سالوٹ جاتا ہے کہ ہائے! الٰہی کیا تھا اور کیا سے کیا ہوگیا! خوشا خاک دیوبند کی زرخیزی وزہے سرزمین دارالعلوم کی مردم آفرینی! کہ انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے ربع اول میں جو بزرگ اس خطہ سے اٹھے ان کے نفوس قدسیہ نے یہاں کے ذروں کو ہمدوش کوکب والنجم بنا دیا اور زمین حقیقت میں رشک زنِ آسمان ہوگئی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب جو انگریزوں سے لڑنے کے بعد مکہ معظمہ میں جاکر قیام گزیں ہوگئے تھے انھوں نے اس ملک کی نئی صورت حالات کے ماتحت یہاں کے مسلمانوں کی دینی اور روحانی واخلاقی تباہ حالی کا جائزہ لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح کعبۃ اللہ کے در و دیوار سے لپٹ کر دیوبند کے لئے دعائیں مانگی ہوں گی کہ خدا اس خطہ کو ہندی مسلمانوں کے لئے "مَثَابَۃً لِلنَّاسِ وَاَمْنًا" بنا دے تاکہ اُن کی دینی نشاۃِ ثانیہ کا سروسامان یہاں سے ہوسکے اور سیاسی طاقت وقوت سے یک بیک محروم ہوجانے کے بعد مسلمان جس دینی ابتری اور روحانی واخلاقی اختلال وپراگندگی کا شکار ہوسکتے تھے اس سے محفوظ

[عہ] ۱۳۱۲ھ میں درجہ قرآن مجید میں داخل ہوئے اور ۱۳۲۵ھ میں دورۂ حدیث کی پوری جماعت میں اول درجے میں کامیابی حاصل کی ۱۳۲۶ھ میں دارالعلوم میں باقاعدہ مدرس مقرر ہوگئے اور کچھ عرصے کے بعد مدرسہ عالیہ فتح پوری کے صدر مدرس بنا کر بھیجے گئے

ہو جائیں۔ چنانچہ ان کی فغانِ نیم شبی وگریۂ صبح گاہی کا یہ اثر ہوا کہ یہاں یکے بعد دیگرے مسلسل ایسے بزرگ پیدا ہوتے رہے جو اس ملتِ برگشتہ بخت کے زخموں پر ٹانکے لگا لگا کر اس کے جسم میں دینی شعور و ملی حمیت کا خون پیدا کرتے رہے، دینِ قیم کی حفاظت وصیانت اور شریعت غرا کی ترقی و اشاعت گویا ایک امانت تھی جو اس عہد سے لے کر اب تک سینہ بسینہ اور دست بدست ایک بزرگ سے اس کے جانشین دوسرے بزرگ کی طرف منتقل ہوتی رہی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ایک چھوٹے سے قصبہ اور ایک مدرسے کی چہار دیواری کے اندر بند ہو کر ان بزرگوں نے بحیثیت مجموعی مسلمانوں کی زندگی کو نئی روح دینے میں جتنے مختلف نوع بنوع اور ہمہ جہتی کام کئے ہیں اتنے دیوبند کے سوا اور کہیں کسی جگہ نہیں ہوئے۔

اب ایسے خوش نصیب تو شاید ہی کوئی ہو جس نے اس سلسلہ کی ابتدائی کڑیوں یا یوں کہئے اس عہد کے صدر اول کو دیکھا ہو۔ البتہ ایسے حضرات بحمد اللہ کم نہیں ہیں۔ جنہوں نے اس عہد کے دورِ آخری کی بہاریں . . . . خود اپنی آنکھ سے دیکھی ہوں گی۔ تصور کیجئے تو ایک نیا عالم ہی نظروں کے سامنے آجاتا ہے ایک طرف حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن ہیں کہ مسندِ درس پر علم و عرفان کے دریا بہا رہے ہیں اور ساتھ ہی خلوتوں میں دنیا کی سب سے بڑی طاقت کا تختہ اُلٹ دینے اور اس ملک کو فرنگی اقتدار سے آزاد کرا دینے کے منصوبے سوچ رہے ہیں۔ زبان قال اللہ اور قال الرسول کے لاہوتی نغموں سے سرشار ہے تو دماغ انقلابی پروگرام سوچنے میں مصروف! کوئی اس کو محسوس کرے یا نہ کرے لیکن ایک بالغ نظر انسان اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ حضرت شیخ الہند کی یہ سرگرمیاں آئندہ آزاد ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کی تعمیر میں نہایت موثر اور کارگر ثابت ہوں گی اور اس کے اثرات ایک عرصہ تک فضا میں محسوس کئے جاتے رہیں گے، دوسری طرف دیکھئے تو عارفِ ربانی حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی تزکیۂ نفس و تجلیۂ باطن کی محفل گرم کر رہے ہیں مسندِ افتا پر بیٹھتے ہیں تو معلوم

ہوتا ہے کہ شیخ ابن ہمام نے ایک دوسرے پیکرِ خاکی میں جنم لیا ہے علم و فن کے نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالی جائے تو حضرت الاستاذ العلامہ مولانا سید محمد انور شاہ کے روپ میں نظر آئیگا کہ حافظ ابن تیمیہ حافظ ابن قیم، ابن دقیق العید، ملا علی قاری اور امام رازی و فارابی ان سب کے دل و دماغ نے مل جل کر ایک قالب میں ظہور کیا ہے۔ شعر و ادب میں نظر آئیگا کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کی زبان سے امرء القیس اور نابغۂ ذبیانی بول رہے ہیں پھر جہاں تک عہد حاضر کے گوناگوں معاملات و مسائل کا اسلامی حل سوچنے اور ان پر فکر کرنے کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں مولانا عبیداللہ سندھی عالم اسلام کے ایک مفکر جلیل کی حیثیت سے نظر آئیں گے۔ وعظ و ارشاد اور اصلاح و تزکیۂ نفس کی انجمن مولانا تھانوی کے دم سے زندہ اور روشن دکھائی دیگی حضرت الاستاذ اسی گلزار سدا بہار کے ایک گل صد رنگ و بلبل ہزار داستان تھے کہ جس محفل میں شریک ہوتے رونق محفل بن کر رہتے تھے جس انجمن میں جا بیٹھتے شمع انجمن بن جاتے تھے۔ آہ صد افسوس کہ اب یہ محفل سونی ہو چلی ہے حضرت مولانا مدنی مدظلہ العالی کو چھوڑ کر اس بزم کے سب ارکان عالم آخرت کو سدھار گئے اور اب یہ بساط زرنگار الٹی ہوئی سی معلوم ہوتی ہے:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم　　تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کئے

۱۳۳۸ھ میں موتمر الانصار نامی ایک انجمن کا جسے حضرت شیخ الہند نے قائم کیا تھا اور جس کے سکریٹری مولانا عبیداللہ سندھی تھے مرادآباد میں ایک نہایت عظیم الشان تاریخی جلسہ منعقد ہوا اس میں حضرت الاستاذ نے "الاسلام" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا جس کی چاروں طرف دھوم مچ گئی اور آپ کی پبلک شہرت کا باقاعدہ آغاز یہیں سے ہوا پھر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مالٹا سے آنے کے بعد آپ نے ۱۹۱۹ء کے آخر اور ۱۹۲۰ء کے شروع میں۔ سہارنپور۔ غازی پور۔ لکھنؤ۔ بنارس کانپور اور علیگڈھ و دہلی وغیرہ کے بڑے بڑے اجتماعات میں حضرت شیخ الہند کے ترجمان کی حیثیت سے جو بلند پایہ تقریریں کیں انھوں نے ملک کے گوشہ گوشہ میں آپ کی عظمت و برتری کا سکہ بٹھا دیا۔ تقریر و خطابت کے علاوہ تحریر و تصنیف کا ذوق بھی شروع سے ہی تھا چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے پرانے

ماہناموں القاسم والرشید میں مستقل اور مسلسل مقالات کے علاوہ آپ نے "العقل والنقل" کے نام سے بھی ایک رسالہ تصنیف کیا جس کی علمی اور دینی حلقوں میں بڑی شہرت ہوئی ان مشاغل کے ساتھ مسند درس بھی آپ کے فیض سے محروم نہیں رہا ایک عرصہ تک خالصتہً لوجہ اللہ تمام علوم وفنون اور خصوصیت سے حدیث شریف کا درس دیوبند میں دیتے رہے اس زمانہ میں حضرت الاستاذ کی زندگی بالکل درویشانہ اور متوکلانہ تھی دارالعلوم کی خدمت درس بالکل مفت انجام دیتے تھے اور معاش کا صرف یہ ایک ذریعہ تھا کہ آپ کے بڑے بھائی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب غالباً سترہ روپیہ ماہوار اپنی جیب سے مولانا کے گھر بھیج دیا کرتے تھے اسی زمانہ میں زیارت حرمین شریفین کے جذبہ بیقرار سے مجبور ہوکر اپنا گھر فروخت کرکے حجاز چلے گئے اور واپس آکر پھر حسب سابق درس حدیث میں مشغول ہوگئے ۱۹۲۸ء میں دارالعلوم دیوبند میں اختلافات رونما ہوئے ان کے نتیجہ میں آپ ایک جماعت کثیر کے ساتھ ڈابھیل منتقل ہوئے چند سالوں کے بعد آپ کا انتخاب دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم کے عہدہ پر ہوا اور اب آپ پھر دیوبند آگئے لیکن سات سال کے بعد آپ کو اس عہدہ سے مستعفی ہونا پڑا اور اب آپ دیوبند میں ہی خانہ نشین ہوکر رہنے لگے یہاں تک کہ اگست ۱۹۴۹ء میں ترک وطن کرکے کراچی تشریف لے گئے اور آخر کار ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی شام کو ریاست بھاولپور میں دو روز علیل رہنے کے بعد داعیِ اجل کو لبیک کہا جنازہ یہاں سے کراچی لایا گیا جہاں علم وفضل کا یہ پہاڑ سپرد خاک کردیا گیا۔

یوں تو مسلمانوں کی دینی اور ملی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو براہ راست حضرت الاستاذ کے فیوض وبرکات سے مستفید نہ ہوا ہو لیکن اس میں آپ کے سب سے زیادہ شاندار اور دیرپا کارنامے دو ہیں۔ ایک حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کے ترجمہ قرآن مجید کی تکمیل اور اس پر حواشی وفوائد اور دوسرا صحیح مسلم کی شرح فتح الملہم ارباب نظر جانتے ہیں کہ حضرت الاستاذ نے کس جامعیت۔ اصابت رائے اور دقتِ نگاہ کے ساتھ قرآن وحدیث کی خدمت کے یہ دونوں شاہکار مرتب کئے ہیں موخرالذکر کا چرچا تو ہندوستان چھوڑ ممالک اسلامیہ تک میں ہے۔ مصر کے اکابرِ علم نے فتح الملہم کی داد دی ہے۔

فنونِ ظاہری میں درک وادراک اور جامعیت وکمال کے ساتھ آپ علومِ باطنیہ سے بھی بہرۂ وافر رکھتے تھے اس سلسلہ میں پہلے حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت ہوئے پھر پیر ومرشد مالٹا کے اسیر ہوگئے تو آپ نے مولانا تھانوی سے رجوع کرلیا اور جب حضرت شیخ الہند واپس آئے تو پھر انھیں کی طرف رجوع ہوگئے نماز انتہائی خشوع خضوع سے پڑھتے تھے۔ خشیۃ اللہ اور شرم وحیا کا پیکر تھے، قلب نہایت نازک اور رقیق پایا تھا۔ لیکن تقریر کے وقت عقل کو کبھی جذبات سے مغلوب نہیں ہونے دیتے تھے جو بات کہتے تھے ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ بہت ناپ تول کرکے کہتے تھے تحریک خلافت کا زمانہ حد درجہ اشتعال اور جذبات کی برانگیختگی کا عہد تھا لیکن اس زمانہ میں بھی کبھی تقریراً یا تحریراً کوئی بات ایسی نہیں کہی جو صرف جذباتیت کا نتیجہ ہو۔ حق بات کہنے میں ہمیشہ بیباک اور نڈر تھے۔ ہر معاملہ میں اپنی رائے صفائی اور آزادی کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ چنانچہ شاید لوگوں کو اب تک یاد ہو کہ دہلی کے ایک عظیم الشان جلسہ میں پنڈت مدن موہن مالویہ کے مقابلہ پر اور ۱۹۲۲ء میں گیا میں جمعیۃ علمائے ہند کے سالانہ جلسہ کے موقع پر کونسلوں کے بائیکاٹ کے مسئلہ پر حکیم محمد اجمل خاں مرحوم کی مخالفت میں حضرت الاستاذ نے کس قدر ہنگامہ آفریں اور معرکۃ الآرا تقریریں کی تھیں۔ طبیعت کے مرنج ومرنجان تھے۔ کسی کو دکھ پہنچانا یا کسی کی بدخواہی کرنا اُن کے دائرہ تصور سے باہر تھا جس سے جو وضع تھی اس کو ہر حالت میں نباہتے تھے جمعیۃ علمائے اسلام کے قیام کے بعد بھی جب کبھی دہلی تشریف لاتے یہ ناممکن تھا کہ کتنی ہی عدیم الفرصتی ہو دو چار گھنٹہ کے لئے اپنے بھتیجہ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اُن کے بچوں اور ہم خدام سے ملنے کے لئے دفتر برہان میں تشریف نہ لاتے۔

جہاں تک سیاست کا تعلق ہے حضرت الاستاذ اپنے مخصوص افتادِ طبع کے باعث کبھی بھی اس میدان کے مردِ دار ورسن نہیں ہوئے البتہ خیالات وافکار میں وہ ہمیشہ حضرت شیخ الہند کی قائم کی ہوئی جمعیت علمائے ہند کے ساتھ رہے اور اس کی مجلس عاملہ کے ممبر کی حیثیت سے اس کے فیصلوں میں برابر کے شریک و سہیم رہے۔ آخر میں جب ہندوؤں کی بد دماغی اور ان کی تنگ نظری سے خوف زدہ ہوکر مسلمانوں کی اکثریت تحریک پاکستان کی ہمنوا ہوگئی تو حضرت الاستاذ بھی اس سے وابستہ ہوگئے۔ اور آخر کار اس ملک کو ہمیشہ کیلئے خیرباد کہہ گئے

تحدیثِ نعمت کے طور پر یہاں اس کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا کہ راقم الحروف کو جہاں اور اکابر دیوبند کی بارگاہ میں خصوصی تقرب کا شرف حاصل رہا ہے جو بلاشبہ اس گنہگار کے لئے ذخیرۂ آخرت ہے حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ بھی خاص محبت کرتے اور شفقت فرماتے تھے۔ اس میں جہاں دخل اس ہیچمیرز کی استعداد کے ساتھ بزرگانہ حسن ظن کو تھا اس بات کو بھی تھا کہ بھائی عتیق (مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی) کے ساتھ خصوصی برادرانہ تعلق کی وجہ سے میں گویا عثمانی خاندان کا ہی ایک فرد بن گیا تھا جب کبھی ملاقات ہوتی انتہائی شفقت اور محبت کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرتے۔ دیوبند جاتا تو کئی کئی وقت کی دعوت کرتے اور خود اپنے ہاتھ سے عمدہ کھانوں کی قابیں میری طرف بڑھا کر مجھ سے کھانے کی فرمائشیں کرتے میری تقریروں اور تحریروں کی بڑی حوصلہ افزائی فرماتے تھے اور اکثر دعائیں دیتے تھے۔ ترکِ وطن کر جانے کے بعد ہم تہیدستانِ قسمت آپ کے فیوض و ارشادات علمیہ سے محروم ہو گئے تھے یہاں تک کہ اس مدت میں خط و کتابت کی سعادت بھی حاصل نہیں ہوئی۔ البتہ ڈیڑھ سال سے زیادہ ہوا کہ کراچی سے ایک عزیز دوست نے لکھا تھا کہ "حضرت مولانا" تم کو یاد کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہاں چلے آؤ۔ اس کے جواب میں راقم الحروف نے اس دوست کو حکیم ناصر خسرو کا صرف یہ شعر لکھ بھیجا تھا

حاجی بہ رہِ کعبہ و من طالبِ دیدار　　او خانہ ہمی جوید و من صاحبِ خانہ

ایک عرصہ تک ساتھ رہنے کی وجہ سے بعض معاملات میں کئی مرتبہ شکوہ سنج ہونے کی نوبت بھی آئی لیکن حضرت الاستاذ کی شفقتوں کی ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ ان سے شکوہ سنج ہونے میں بھی ایک لذت ملتی تھی پھر دل میں خواہ کیسے ہی شکوے ہوں لیکن جہاں خندۂ زیرِ لب اور آنکھوں کی ایک خاص جنبش کے ساتھ آپ نے خطاب کیا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ دل میں شکایت و گلہ کا گویا کبھی احساس پیدا ہی نہیں ہوا۔ آہ صد حیف! اب یہ شفقتیں خواب و خیال ہو کر رہ گئیں

وكنا كندماني جذيمة حقبة　　من الدهر حتى قيل لن يتصدعا

فلما تفرقنا كأني ومالكا　　لطول اجتماع لم نبت ليلة معا

حضرت الاستاذ کا حادثۂ وفات ملتِ اسلامیہ کے جسم پر ایک ایسا زخم کاری ہے جو عرصہ تک مندمل نہیں ہو سکتا۔ اس حادثہ سے علم شریعت کی دیوار میں جو شگاف پیدا ہو گیا ہے وہ مدت تک بند نہیں کیا جا سکیگا انکا وجود اس عہدِ ضلالت و گمراہی میں اللہ کی رحمت کا ایک سایہ تھا۔ وہ شریعتِ مصطفوی کے ناموس اور دینِ قیم کی آبرو تھے۔ اللہ تعالےٰ ان کی قبر کو نور سے بھرپور کرے اور آخرت میں صدیقین و شہداء کیساتھ انکا حشر فرمائے۔ آمین!